© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

خلیفہ عبدالحکیم

۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم ہُوا۔ اس کے بانی اور پہلے ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ اس زمانے میں مولانا محمد حنیف ندویؒ گوجرانوالہ میں اقامت گزیں تھے اور ایک ہفت روزہ اخبار "الاعتصام" کے ایڈیٹر تھے جو ان دنوں گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ میں اس اخبار کا معاون ایڈیٹر تھا۔

مئی ۱۹۵۱ء کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ قدرے لمبے اور متناسب ڈیل ڈول کے ایک صاحب جو کھلے پائنچے کا پاجامہ پہنے اور ٹھنڈی شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھے، دفتر "الاعتصام" تشریف لائے اور مولانا حنیف ندوی سے ملے، وہ دھیمے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بولتے اور رُک رُک کر بات کرتے تھے۔ یہ رشید اختر ندوی تھے جو اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کام کرتے تھے۔ اُنھوں نے مولانا کو بتایا کہ لاہور میں ایک اہلِ علم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہیں، جنھوں نے حکومت کی اعانت سے ایک تصنیفی مرکز قائم کیا ہے، جس کا نام 'ادارہ ثقافتِ اسلامیہ' رکھا گیا ہے۔ میں اس میں کام کرتا ہوں۔ خلیفہ صاحب اصحابِ علم کے بہت مدّاح اور قدر دان ہیں۔ اُن کی مجلس میں آپ کا ذکر ہوا تو ملاقات کے متمنی ہوئے۔ اُنھوں نے آپ کو ادارے میں تشریف لانے کی دعوت دی ہے ——— میں نے پہلی مرتبہ رشید اختر ندوی صاحب سے خلیفہ صاحب کا اسمِ گرامی اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کا نام سُنا۔

مولانا لاہور آئے اور خلیفہ صاحب سے ملے۔ اُنھوں نے مولانا سے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس سے وابستگی اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اُن کی پیش کش کے تمام پہلوؤں پر غور کیا، از راہِ کرم مجھ سے بھی مشورہ کیا اور ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اس سے پیشتر ادارے میں علمی خدمات سر انجام دے رہے تھے۔

مولانا حنیف ندوی ؒ کے ادارے میں آنے سے ایک مہینے بعد یعنی ۱۵ جون ۱۹۵۱ء کو مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی کو رفیق ادارہ مقرر کیا گیا اور پھر نومبر ۱۹۵۴ء میں بشیر احمد ڈار، شاہد حسین رزاقی اور رئیس احمد جعفری کو اس کے حلقۂ تصنیف و تالیف میں شامل کر لیا گیا۔

مولانا حنیف ندوی ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہونے سے کچھ عرصے بعد گوجرانوالہ کی سکونت ترک کر کے مستقل طور سے لاہور میں رہائش پذیر ہو گئے تھے، اور اخبار "الاعتصام" بھی جس کے وہ ایڈیٹر تھے، گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا تھا اور اس کی ادارت میرے سپرد کر دی گئی تھی۔

ان تمام حضرات سے جو ادارے سے وابستہ تھے، میرے مراسم قائم ہو گئے تھے، اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کا دفتر میرے لیے "علاقہ غیر" نہ تھا۔ میں دس پندرہ دن کے بعد ادارے میں حاضری دیتا اور ان حضرات سے ملتا تھا۔ مولانا حنیف ندوی سے البتہ روزانہ شام کے بعد کسی ہوٹل میں ڈیڑھ دو گھنٹے کی نشست رہتی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی جس میں لطائف کا عنصر بالخصوص شامل ہوتا۔

رئیس احمد جعفری بھی 'ہوٹل باز' تھے۔ وہ میکلوڈ روڈ پر وکٹوریہ ہوٹل کے عقب میں ٹیگور پارک میں رہتے تھے۔ شام کے بعد چلتے پھرتے اس ہوٹل میں آجاتے، جس میں ہم ڈیرہ جمائے ہوتے۔ وہ لطیفہ سُنانے کے عادی تو نہ تھے، (میرا خیال ہے انھیں کوئی لطیفہ آتا بھی نہ تھا) البتہ لطیفہ سننے کا چسکا بہت تھا۔ لطیفہ سُن کر خوب داد دیتے اور کِھلکِھلا کر ہنستے۔ میں کبھی کبھی اُن کے گھر بھی جاتا، وہ بھی مہربانی فرماتے اور بعض اوقات میرے اخبار "الاعتصام" کے دفتر تشریف لے جاتے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مجھے عام طور پر لکھنے پڑھنے کا کوئی کام بھی مل جاتا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو ادارے کے ملازم برکت اللہ کے ہاتھ مجھے بھیجا جاتا تھا۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے اس کا معقول معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ ادارے میں آنے جانے کے باوجود میں نے ابھی تک خلیفہ صاحب کو نہیں دیکھا تھا، لیکن رفقائے ادارہ جو ان کی باتیں سناتے وہ عجیب وغریب اور نہایت دلچسپ تھیں۔

اس زمانے میں تمام رفقائے ادارہ دس بجے کے لگ بھگ خلیفہ صاحب کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور باجماعت چائے پی جاتی تھی۔ چائے کے ساتھ سب کو ایک ایک بسکٹ دیا جاتا تھا۔ یہ مجلس تقریباً گیارہ بجے تک جاری رہتی۔ بعض دفعہ ادارے سے باہر کے اہلِ علم بھی تشریف لے آتے اور شریکِ مجلس ہوتے۔ اسے "خلیفہ صاحب کا دربار" کہا جاتا تھا، جس میں خالص علمی اور فلسفیانہ بحثیں بھی ہوتی تھیں، ادبی موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی تھی، سیاسیات پر بھی ہلکا پھلکا تبصرہ ہوتا تھا، شعروشاعری بھی ہوتی تھی، تنقید و تبصرے بھی ہوتے تھے، نکاتِ تصوّف وسلوک بھی بیان کیے جاتے تھے اور لطائف وظرائف کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔

لطیفے کے معاملے میں خلیفہ صاحب کی بڑی شہرت تھی۔ کسی قسم کے لوگ بیٹھے ہوتے، ہر چند مشاہدۂ حق کی گفتگو جاری ہوتی، اثنائے گفتگو میں خلیفہ صاحب کو لطیفہ یاد آجاتا تو وہ بیان کیے بغیر نہ رہ سکتے۔ وہ اکبر بادشاہ کا دربار تھا۔ "رتن" بیٹھ جاتے تھے اور ہر "رتن" اپنے انداز سے بلاجھجک ہر موضوع پر بات کرتا تھا اور ایک ایک مضمون کو سو سو رنگ سے باندھا جاتا تھا۔

جوں ہی خلیفہ صاحب کا دربار سجتا، سب حاضرین بے تکلّفانہ انداز میں گفتگو شروع کر دیتے اور لطیفے پر لطیفہ اور شعر پر شعر چڑھا آتا اور قہقہوں کا مینہ برستا رہتا۔

مولانا حنیف ندوی اور سید جعفر شاہ پھلواروی سے وہ کہا کرتے تھے کہ آپ حضرات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، آپ کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ مسجدوں کے درس وخطابت کے ماحول میں گزرا، لیکن آپ کے ذہن کی تازگی اور فکر کی شگفتگی بحال رہی اور اس کا کوئی گوشہ بھی نہیں مرجھایا۔ بلکہ بعض اوقات آپ ہم سے آگے کی بات کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رفقائے ادارہ کا وہ انتہائی احترام کرتے تھے۔ ٹھیک ایک بجے دفتر سے اُٹھتے۔ بار ہا ایسا ہوا کہ سب کو گاڑی میں بٹھالیا اور ہر ایک کو اس کے گھر چھوڑ کر آئے۔ یہ محاورے سے بالکل اُلٹ، اچھے کو اچھے کے گھر چھوڑ کر آنے کا معاملہ تھا۔ بالخصوص مولانا حنیف ندوی اور شاہ صاحب سے بدرجہ غایت تکریم سے پیش آتے اور عام طور پر اُنھیں خود گھر چھوڑ کر آتے۔ رفقائے ادارہ کی موجودگی میں کوئی ان سے علمی سوال کرتا تو بالعموم مولانا ندوی اور شاہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہتے، عالم یہ ہیں، ان سے پُوچھیے، میں تو ان میں جاہل بیٹھا ہوں۔ یہ ان کے اظہارِ انکسار اور اکرامِ رفقا کی ایک ادائے دلنواز تھی، ورنہ اپنی ذات سے وہ گلستانِ علم و کمال اور گلشنِ شعر و ادب تھے۔ ان کے بعض افکار اور بیانِ مدعا کے بعض پہلوؤں سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، اور اختلاف کس سے نہیں ہوتا، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ تحقیق و کاوش کے کسی موضوع میں بند نہ تھے، ہر مسئلے سے متعلق واضح اور مدلّل بات کرتے تھے۔

ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ ادارے کے کسی چھوٹے بڑے ملازم اور رفیق کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے تنخواہوں کی ادائگی میں دو چار دن یا اس سے زیادہ عرصہ تاخیر کا اندیشہ ہوتا تو اپنی گرہ سے سب کو بروقت تنخواہ دے دیتے۔

مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ کسی مالی پریشانی کا شکار ہو گئے اور کئی دن چُپ چُپ سے رہے۔ خلیفہ صاحب نے علیحدگی میں پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ کئی روز سے آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں؟" پہلے تو بتانے سے گریز کیا لیکن اصرار بڑھا تو سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ خلیفہ صاحب نے کہا: "یہ بات پہلے دن ہی آپ کو بتا دینا چاہیے تھی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم سب لوگ جو یہاں کام کرتے ہیں، ایک ہی کنبے کے افراد ہیں"—— پھر جتنی رقم کی انھیں ضرورت تھی دے دی۔ فرمایا: "ضرورت ہر شخص کو پڑتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کی ضرورتوں کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔ کام یہاں کریں اور ضرورت کے وقت مانگیں کسی اور سے، یہ نامناسب بات ہے۔"

سید جعفر شاہ صاحب پھلواری جس زمانے میں سمن آباد میں اپنا مکان بنا رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے، ایک دن دفتر آئے تو ان کے کپڑے کچھ میلے سے تھے۔ اس دور کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سیکرٹری نے اُنھیں دیکھا تو قدرے سختی سے کہا: "یہ آپ نے دفتر کا لباس پہن رکھا ہے؟ دفتر کے کچھ آداب ہوتے ہیں، ان کی پابندی کرنی چاہیے۔"

شاہ صاحب مُسکرائے اور خاموش ہوگئے۔ اُنھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے کمرے میں جاکر کام میں مصروف ہوگئے۔ اب سیکرٹری صاحب خلیفہ صاحب کے پاس گئے اور کہا اپنے سکالروں کو دفتر کے آداب اور لباس پہننے کا طریقہ سکھایے۔ خلیفہ صاحب نے جواب میں کہا: وہ مکان تعمیر کرا رہے ہیں، کپڑے کچھ میلے ہوگئے تو کیا ہوا؟ آپ کو اس سے کیا تعلق؟ جایے اپنا کام کیجیے۔ لوگوں کے کپڑے دیکھنا اور ان کی شکایت کرنا آپ کے فرائض میں شامل نہیں۔

اس سے چند روز بعد شاہ صاحب نے ایک ہزار رُوپے قرض مانگا خلیفہ صاحب نے سیکرٹری کے نام چٹ بھیجی کہ دفتر کی رقم سے انھیں ایک ہزار روپیہ دے دیا جائے۔ جو شخص چٹ لے کر گیا، سیکرٹری نے اس سے کہا: "خلیفہ صاحب نے ان مولویوں کو سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ جاؤ ان سے کہہ دو، میں اتنی رقم دفتر کے خزانے سے نہیں دے سکتا۔" اس نے اسی طرح آکر خلیفہ صاحب سے کہہ دیا۔ اب خلیفہ صاحب اپنی نشست سے اُٹھے اور سیکرٹری کے کمرے میں گئے۔ بولے: "آپ نے ہزار روپے کی رقم شاہ صاحب کو کیوں نہیں دی؟" جواب دیا: "میرے پاس ان کے لیے کوئی رقم وقم نہیں ہے۔" یہ الفاظ سنتے ہی خلیفہ صاحب طیش میں آگئے۔ بولے: "جاؤ! دفتر سے نکل جاؤ۔" سیکرٹری صاحب چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ خلیفہ صاحب پھر گرجے: "تم نے میری بات نہیں سُنی۔ میں کہتا ہوں نکل جاؤ، یہاں سے — یہ سکالر ہی دفتر کا اصل سرمایہ ہیں۔ ان کے بغیر دفتر بے معنی ہے۔ دفتر کو تمھاری ضرورت نہیں، ان کی ضرورت ہے۔" پھر دو تین چپراسیوں کو بلایا اور حکم دیا کہ "میرے سامنے کاغذات پہ قبضہ کرلو۔ دفتر کا کوئی کاغذ یہ کمرے سے باہر نہ لے جاسکیں۔"

مولانا حنیف ندوی نے بتایا، اس سے کچھ عرصہ بعد میں ٹمپل روڈ پر جا رہا تھا کہ اتفاقاً وہی سیکرٹری صاحب سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں چاہتا تھا، ان سے علیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلیک کروں اور خیر خیریت پوچھوں، لیکن وہ مجھے دیکھ کر لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتے ہوئے دوسری طرف ہو گئے۔

کوئی شخص بلا اطلاع و اجازت دو چار روز دفتر نہ آتا تو خلیفہ صاحب یہ نہیں کہتے تھے کہ کیوں نہیں آیا، یہ کام چور ہے یا دفتر کا خیال نہیں رکھتا اور غیر حاضر رہتا ہے۔ بلکہ اس کی غیر حاضری کا معذرتی پہلو تلاش کرتے اور کسی سے کہتے: "فلاں آدمی اتنے دنوں سے نہیں آیا، اس کے گھر جا کر پتا کرو، بیمار نہ ہو، یا کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔ بیمار ہے تو کسی اچھے معالج سے اس کا علاج کراؤ، کوئی اور مجبوری ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے"

لطیفے کے بارے میں خلیفہ صاحب بہت مشہور تھے یا یوں سمجھیے کہ بہت بڑے لطیفہ باز تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ جہاں وہ اقلیم علم کے بادشاہ تھے، وہاں مملکتِ لطائف و ظرائف پر بھی ان کی حکمرانی تھی۔ اگر لطیفے کی کوئی بات آ گئی تو ناممکن تھا کہ وہ خاموش رہیں اور زبان کو صبر و ضبط کے زاویوں میں رکھ سکیں۔

ایک مرتبہ کسی موضوع پر تحقیق کے سلسلے میں ایک امریکن خاتون لاہور تشریف لائیں، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں خلیفہ صاحب کی خدمت میں بھی آئیں۔ دفتر کا ماحول اور ادارے کا محلِ وقوع دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ خلیفہ صاحب سے کہا: "آپ کا دفتر کیا ہے، جنّت ہے" خلیفہ صاحب فوراً بولے: "اس جنّت میں حور کی کمی تھی، وہ آپ نے پوری کر دی"

ایک دن خلیفہ صاحب سے ملاقات کو ایک عالمِ دین تشریف لائے، اسم گرامی پوچھا تو بتایا: پیر سید عبدالحکیم شاہ قادری چشتی سہروردی سند یافتہ دارالعلوم فلاں۔۔۔۔ اور ساتھ ہی فرمایا: "آپ کا نامِ نامی بھی تو یہی ہے" خلیفہ صاحب نے جواب دیا: "جی ہاں! نام تو میرا بھی یہی ہے لیکن اگاڑی پچھاڑی نہیں ہے"

ان کے لطیفوں کی تین قسمیں ہیں۔ کچھ لطیفے وہ ہیں جو گفتنی بھی ہیں اور نوشتنی بھی۔ دوسرے وہ جو فقط گفتنی ہیں، نوشتنی نہیں۔ تیسری قسم کے وہ لطیفے ہیں جن میں کا ایک حصہ نوشتنی ہے اور ایک گفتنی۔ اب تیسری قسم کا ایک لطیفہ عرض کرتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُنھوں نے بتایا، آزادیِ وطن سے کئی سال پہلے کی بات ہے میں لندن میں تھا۔ ایک مرتبہ ہندوستانیوں کا ایک جلسہ وہاں کے کسی ہال میں ہوا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان دنوں خلیفہ قادیان مرزا محمود بھی لندن میں تھے، اُنھیں بھی شریکِ جلسہ کیا گیا تھا۔ حُسنِ اتفاق یا سوئے اتفاق سے میری سیٹ ان کے ساتھ تھی۔ اب تک نہ اُنھوں نے مجھے دیکھا تھا، نہ مجھے ان کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں گیا تو وہ پہلے سے اپنی سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ اُنھوں نے اپنا تعارف کرایا، میں نے بھی کرایا۔ خیر خیریت کے مبادلے کے بعد اُنھوں نے مجھ سے سوال کیا: "خلیفہ صاحب آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور قدیم و جدید علوم و حالات پر آپ کی نظر ہے، آپ بھی نہیں مانتے کہ نبوت جاری ہے؟"

میں نے جواب دیا: "میں تو کہتا ہوں کہ نبوت جاری رہنی چاہیے۔ جو حالات اور علوم چودہ سو سال پہلے تھے اب اس سے مختلف ہیں اور بے شمار گوشوں میں بے شمار تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئی ہیں اور آئندہ ہوں گی۔ دُنیا تیز رفتار ہے، کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور یہ رفتار آئندہ اور تیز ہوگی۔ اب کوئی ایسا نبی آنا چاہیے جو موجودہ مسائل کو سمجھتا اور ان کے حل و کشود کی استعداد رکھتا ہو ـــ لیکن نبی ہو، ..... نہ ہو، خلیفہ صاحب نے بات کو "لیکن" کی پٹڑی پر چڑھا کر جو کچھ کہا، افسوس ہے، وہ نوشتنی نہیں ہے۔ اس مجبوری کی بنا پر اس کے بجائے نقطے ڈال دیے گئے ہیں۔

دراصل "لیکن" اردو زبان میں ایک جھاڑو کا نام ہے، جس سے پہلی بات کا صفایا ہو جاتا ہے اور مگر کے معنی مگرمچھ کے ہیں، جو پہلی بات کو نگل جاتا ہے۔ خلیفہ صاحب نے یہ لیکن، یا مگر انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اُنھوں نے بتایا کہ اس کے بعد دو گھنٹے جلسہ جاری رہا۔ اس اثنا میں نہ اُنھوں نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے اُن سے مخاطب ہونے کی ضرورت محسوس کی۔ جلسے کے اختتام کے بعد بھی میں نے ان کو مصافحے کی زحمت نہیں دی۔ دوسرے دوستوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رفقائے ادارہ کا (جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں) وہ بہت خیال رکھتے اور احترام کرتے تھے۔ جون کے آغاز سے اگست کے آخر تک انھیں اجازت تھی کہ وہ کسی ٹھنڈے پہاڑی مقام پر چلے جائیں اور وہاں جا کر تصنیفی خدمات سر انجام دیں۔ ان تین مہینوں کا دفتر کی طرف سے "ہل الاونس" دیا جاتا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ سخت گرمیوں کے موسم میں دفتر کے خرچ پر وہ لاہور سے ہلیں اور ہلتے ہلاتے اپنی پسند کے مطابق کسی ٹھنڈی جگہ پر جا کر کام کریں، چنانچہ کوئی صاحب یہاں سے ہل کر مری چلے جاتے، کوئی ایبٹ آباد جا قیام کرتے اور کوئی کوئٹہ کو روانہ ہو جاتے تھے۔ رئیس احمد جعفری صاحب کو کوئٹہ کی آب و ہوا پسند تھی، وہ ہر سال وہاں جا ٹھکانا بناتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی چل پھر کر میلہ دیکھنے کے عادی تھے۔ کسی سال کوئٹہ کا، کسی سال مری کا اور کسی سال ایبٹ آباد کا قصد فرماتے تھے۔

اگر کوئی غیر مسلم مستشرق خلیفہ صاحب کے سامنے اسلام کے کسی پہلو کو محلِ اعتراض ٹھہراتا تو وہ جوش میں آجاتے اور اُس کی بات اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ ایک مرتبہ دو برطانوی مستشرق لاہور آئے اور ادارے میں ٹیلی فون کر کے خلیفہ صاحب سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ خلیفہ صاحب نے ان سے وقت مقرر کر کے ادارے کے ایک اہل کار سے کہا کہ مہمان آئیں تو پہلے انھیں ٹھنڈا مشروب پیش کیا جائے، اس سے تھوڑی دیر بعد گرم گرم کافی پلائی جائے۔ لیکن یہ چیزیں اس وقت لائی جائیں جب میں کہوں۔

مہمانوں کی آمد پر دونوں مشروب تیار کر لیے گئے۔ ٹھنڈا بھی اور گرم بھی! گفتگو شروع ہوئی تو ایک مستشرق نے اسلام کے کسی حکم پر اعتراض کر دیا۔ اب خلیفہ صاحب نے جواب دینا شروع کیا اور پورا ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرتے رہے۔ وہ جلال میں تھے اور اس قدر روانی اور تیزی سے اسلام کا دفاع کر رہے اور عیسائیت کے بعض پہلوؤں کو ہدفِ تنقید ٹھہرا رہے تھے کہ دونوں مستشرق ان کے سامنے عاجز دکھائی دے رہے تھے۔

اب ٹھنڈا مشروب گرم ہو گیا تھا اور گرم نے ٹھنڈک پکڑ لی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب سب کچھ بھول چکے تھے اور اُن کا سلسلۂ تقریر ختم ہونے کے آثار دُور دُور تک نظر نہیں آتے تھے۔ اتنے میں دفتر کے ایک صاحب آئے اور ان کے کان میں کہا، مہمانوں کو کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھلاتا پلاتا بھی ہے یا تقریر ہی میں الجھائے رکھنا ہے؟ یہ سُن کر خلیفہ صاحب چونکے اور مہمانوں سے کہا: معاف کیجیے گا، آپ نے آتے ہی میری توجہ دوسری طرف مبذول کرادی اور میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔" اس کے بعد بات چیت کا رُخ پلٹا اور مہمانوں کے لیے نیا سامانِ اکل و شرب تیار کیا گیا۔

۱۹۵۴ء میں مولانا سید داؤد غزنوی پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ ان کا تعلق جناح عوامی لیگ سے تھا اور وہ حزبِ اختلاف میں تھے۔ اپنے نقطۂ نظر سے حکومت کے جن اقدامات کو وہ غلط سمجھتے، ان کی پُورے زور سے ڈٹ کر مخالفت کرتے تھے۔ حرفِ اعتذار سے وہ آشنا ہی نہ تھے۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ ان دنوں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ پنجاب اسمبلی میں سالانہ بجٹ پیش ہوا، اور اس پر بحث ہونے لگی مولانا داؤد غزنوی نے اس میں حصہ لیا اور تقریر میں اس کی بہت سی شقوں کو نشانۂ تنقید بنایا۔ اس زمانے میں بزمِ اقبال کی طرف سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی چھوٹی سی کتاب "اقبال اور مُلّا" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے حوالے سے خلیفہ صاحب مولانا کی تنقید کی زد میں آگئے۔ اخبارات میں اسمبلی کی کارروائی اور مولانا کی تقریر شائع ہوئی جو خلیفہ صاحب نے بھی پڑھی۔ دفتر آئے تو مولانا حنیف ندوی سے بہ اسلوبِ شکوہ مولانا غزنوی کی ناقدانہ تقریر کا ذکر کیا اور فرمایا۔ میں مولانا داؤد غزنوی کو ایک بڑا عالم سمجھتا تھا، لیکن یہ تو محض سیاسی آدمی نکلے۔ علم سے تو ان کا تعلق نہیں ہے۔

روزانہ کے معمول کے مطابق شام کے بعد ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ مولانا ندوی نے خلیفہ صاحب کی اس گفتگو کا ذکر کیا اور فرمایا۔ مولانا کو خلیفہ صاحب کے بارے میں وہ الفاظ نہیں کہنا چاہئیں تھے، جو اُنھوں نے کہے۔

مولانا حنیف ندویؒ ان دنوں غزالی کے فلسفیانہ پہلوؤں پر کام کر رہے تھے عام طور سے وہ اس موضوع کی کتابیں مولانا داؤد غزنوی کے کتب خانے سے لیتے تھے۔ اُنھیں بھی غزالی سے دلچسپی تھی اور غزالی کے سلسلے کی بہت سی کتابیں ان کے مطالعہ رہتی تھیں، اور ان کے اکثر مقامات پر اُنھوں نے نشان بھی لگائے تھے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعض چیزیں لکھی بھی تھیں ۔ مولانا ندوی نے یہ سب باتیں خلیفہ صاحب کو بتائیں اور مولانا کے علم و فضل کی فراوانیوں کا ذکر کیا، مگر وہ نہیں مانے۔ جو بات اُن کے متعلق دل میں بیٹھ گئی تھی، اس نے مضبوط جگہ بنالی تھی اور نکلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

اُس زمانے میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے چیئرمین مولوی محمد شفیع مرحوم تھے، تحقیق و کاوش کی وادیوں میں اُن کی بڑی شہرت تھی اور بعض مسائل میں ان کی اپروچ کے ڈانڈے مستشرقین سے ملتے تھے۔ اُنھوں نے چند موضوعات پر گفتگو کے لیے لاہور کے بعض اہلِ علم حضرات کی میٹنگ بلائی۔ خلیفہ صاحب کو بھی بذریعہ ٹیلیفون دعوتِ شرکت دی۔ مولانا حنیف ندوی کی روایت کے مطابق خلیفہ صاحب نے مولوی محمد شفیع سے پوچھا، آپ نے اس میٹنگ میں کن کن لوگوں کو بلایا ہے؟ اُنھوں نے جن مدعوین کے نام لیے، ان میں مولانا داؤد غزنوی کا نام بھی شامل تھا۔ خلیفہ صاحب نے ان کا نام سُن کر کہا، آپ اپنے دفتر میں سیاسی مسائل پر بحث کرنا چاہتے ہیں؟ داؤد غزنوی سیاسی آدمی ہیں، ان کو علمی مسائل سے کیا واسطہ؟ اُنھوں نے جواب میں بتایا کہ وہ صاحبِ مطالعہ اور پڑھے لکھے بزرگ ہیں، میں انھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ آپ انہیں ملیں گے اور ان کی باتیں سنیں گے تو خوش ہوں گے، جو بات آپ نے اُن کے متعلق کسی وجہ سے دل میں بٹھا رکھی ہے، نکل جائے گی۔

۱۹۵۵ء کے اپریل کی کوئی تاریخ تھی کہ مولوی محمد شفیع صاحب کی یہ میٹنگ ہوئی، جس میں مولانا داؤد غزنوی اور خلیفہ صاحب شامل تھے۔ اب فضل و کمال کے یہ دونوں پہلوان علمی اکھاڑے میں اُترے اور پنجہ آزمائی ہوئی تو اس نتیجے پر پہنچے کہ جوڑ برابر کا ہے، کوئی دوسرے کو پچھاڑ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا کہ میں شیش محل روڈ پر اپنے اخبار "الاعتصام" کے بڑے دروازے میں کھڑا تھا، جس کی اوپر کی منزل میں مولانا داؤد غزنوی کا مسکن اور نیچے بڑے ہال کے ایک طرف اُن کا دفتر تھا۔ میں نے دیکھا کہ کالے رنگ کی ایک کار دروازے کے سامنے آکر رُکی، جس کی فرنٹ سیٹ پر مولانا داؤد غزنوی بیٹھے تھے۔ میں اُنھیں دیکھتے ہی احتراماً دروازے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دو سیڑھیاں نیچے اُترا اور سڑک کے برابر کی سطح پر کھڑا ہو گیا۔ جو صاحب کار چلا رہے تھے وہ جلدی سے باہر نکلے، کار کے آگے سے ہوتے ہوئے دوسری طرف گئے۔ گاڑی کے بائیں جانب کا دروازہ کھولا اور نہایت تکریم کے ساتھ مولانا کو گاڑی سے اُتارا۔ ان کے چہرے کی سفید رنگت پر سُرخی کا غلبہ اور گٹھا ہوا معتدل جسم اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ انگریزی سوٹ پہنے ہوئے، پورا قد اور ڈاڑھی مونچھ صاف — دو تین منٹ کھڑے مولانا سے باتیں کرتے رہے اور پھر مصافحہ کر کے گاڑی میں بیٹھے اور سلام کر کے چلے گئے۔ میں وہیں اپنی جگہ کھڑا رہا، ان کی باتیں نہیں سُن سکا۔

مولانا دروازے کی طرف آئے تو میں نے سلام کیا۔ اُنھوں نے سلام کا جواب دے کر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے از راہِ شفقت فرمایا: تشریف رکھیے۔ میں بیٹھ گیا تو بولے: معلوم ہے، یہ کون صاحب تھے؟ — پھر خود ہی جواب دیا، یہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب تھے، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر۔ مجھے تو معلوم ہی نہ تھا، یہ اتنے پڑھے لکھے، اتنے باخبر اور صاحبِ مطالعہ شخص ہیں۔ آج مولوی محمد شفیع صاحب نے بعض مسائل سے متعلق گفتگو کے لیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے دفتر میں جو میٹنگ بلائی تھی، اس میں یہ بھی شامل تھے، انھوں نے سلجھے ہوئے اور مدلّل انداز میں بہت عمدہ باتیں کیں۔ گفتگو میں یا انھوں نے حصّہ لیا یا میں نے۔ دوسرے حضرات تو زیادہ تر سامعین یا مؤیدین ہی تھے۔

شام کو معمول کے مطابق مولانا حنیف ندوی سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے بتایا کہ مولانا کو گھر چھوڑ کر خلیفہ صاحب سیدھے دفتر آئے اور تمام رفقا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ میٹنگ کی کارروائی سُنائی اور مولانا داؤد غزنوی کی تعریف کی اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "آپ کی بات صحیح ہے۔ مولانا غزنوی واقعی صاحبِ نظر عالم ہیں اور ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے خلیفہ صاحب کو دیکھا اور اس کے بعد ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں کئی مرتبہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی باتیں سننے اور اپنی سُنانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اتفاق ہوا۔

اس سے چند روز بعد مولانا حنیف ندوی سے ایک مضمون لینے کے لیے میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ گیا۔ وہ چائے کا وقت تھا اور فیلو حضرات خلیفہ صاحب کے کمرے میں جا رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ مولانا نے میرا ان سے تعارف کرایا، پھر جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے میرے بارے میں کچھ الفاظ کہے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔

اس کے بعد خلیفہ صاحب نے الاعتصام کا ذکر کیا اور اس دور میں جن خطوط پر وہ چل رہا تھا، اس کی تعریف کی۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ اس عاجز کی حوصلہ افزائی کی۔

مولانا عبدالواحد غزنوی کا ذکر بھی کیا اور فرمایا جس زمانے میں وہ چینیاں والی مسجد میں درس و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، اس زمانے میں ہم اسی علاقے میں رہتے تھے اور مولانا سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ اپنے دور کے ولی اللہ تھے، بارگاہِ الٰہی میں اُن کی دُعاؤں کو شرفِ قبولیت حاصل ہوتا تھا۔

مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں فرمایا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ایک میٹنگ میں پتا چلا کہ وہ وسیع المطالعہ اور عالی ظرف عالم ہیں۔ حدیث و فقہ کے بارے میں بعض چیزیں ان سے سمجھنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، یا یوں کہیے کہ ان کی خدمت میں پہلی حاضری تھی۔ گھنٹہ پون گھنٹہ نشست رہی اور پھر سب حضرات اپنے اپنے کمروں میں جا کر کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے مولانا حنیف ندوی سے مضمون لیا اور واپس آ گیا۔

اس سے کچھ مدت بعد پھر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ گیا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ دفتر کے لان میں مجلس جمی ہوئی تھی اور ایک چھتر تنا ہوا تھا۔ خلیفہ صاحب نہایت شفقت سے ملے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ مجھے بھی چائے کی پیالی اور ایک بسکٹ دیا گیا۔ معلوم نہیں پہلے کیا باتیں ہو رہی تھیں، میرے جانے پر علمائے اہلِ حدیث کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا: مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری دونوں جلیل القدر عالم تھے، لیکن مولانا ثناء اللہ صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ بہت بڑے مناظر اور حاضر جواب تھے اور عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار شعر اُنھیں یاد تھے، جو وہ دورانِ تقریر و مناظرہ میں برمحل پڑھتے اور داد پاتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب خلیفہ صاحب سے مولانا حنیف ندوی نے بات پکڑی۔ اُنھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا ثناء اللہ صاحب ایک آریہ سماجی مناظر سے مناظرہ کرنے دہلی گئے۔ اس زمانے میں ایک مشہور اہلِ حدیث عالم نے مولانا ثناء اللہ صاحب کے خلاف بعض مسائل سے متعلق ایک اشتہار شائع کیا تھا، جس میں کچھ ایسی باتیں ان کی طرف منسوب کی گئی تھیں جن سے ان کا اسلام ہی مشکوک قرار پاتا تھا۔ وہ اشتہار آریہ سماجی مناظر کے ہاتھ آ گیا۔ وہ عربی، فارسی وغیرہ زبانیں جانتا تھا اور عمل و عقیدے کے بارے میں علمائے دین کے باہمی اختلافی مسائل سے بھی آگاہ تھا۔ دونوں فریق مناظرے کے میدان میں اُترے تو آریہ سماجی مناظر اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہاتھ میں اشتہار لہراتے ہوئے بولا: "حضرات! میں تو یہاں کسی مسلمان عالمِ دین سے مناظرہ کرنے آیا ہوں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب میرے لیے بے شک قابلِ احترام ہیں، لیکن یہ دیکھیے اشتہار، ان کے اسلام کو تو ان کی جماعت کے اہلِ علم بھی تسلیم نہیں کرتے۔ میں اُنھیں کیسے مسلمان سمجھوں؟"

[illegible] اللہ صا[illegible]ب پر یہ بہت بڑا مناظرانہ وار تھا، کوئی اور ہوتا تو گھبرا اُٹھتا اور لاجواب ہو کر میدان چھوڑ جاتا یا عقیدہ و عمل کی توجیہات و توضیحات میں اس طرح اُلجھ جاتا کہ آریہ مناظر اپنے مقصد میں کامیاب قرار پاتا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نہایت اطمینان سے مُسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اُٹھے اور فرمایا: حضرات! میرے دوست نے بالکل ٹھیک کہا۔ سب جانتے ہیں کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہوا جاتا ہے۔ میں آپ تمام حاضرینِ مجلس کے سامنے، آپ کو گواہ بنا کر کلمۂ شہادت پڑھتا ہوں اور اسلام قبول کرتا ہوں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ اب تو میرے اسلام میں کوئی شک نہیں رہا۔ آئیے مناظرہ کیجیے۔"

خلیفہ صاحب یہ لطیفہ سُن کر محظوظ ہوئے اور کہا مناظرہ ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق محض علم سے نہیں، حاضر جوابی سے بھی ہے۔ مناظر کے لیے حاضر جواب ہونا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور حریف کا ہر وار خوش دلی سے سہ جانا اور پھر اس پر جوابی حملہ کرنا نہایت ضروری ہے
بعض دفعہ کم علم شخص محض حاضر جوابی اور حاضر دماغی سے بہت بڑے عالم کو شکست
دے دیتا ہے۔

اب لطیفہ سُنانے کو میرا بھی جی چاہا اور میں نے دو لطیفے سنائے جو مناظروں سے
متعلق ہیں۔

ایک مرتبہ مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں حیاتِ مسیح اور مماتِ مسیح پر مسلمانوں
اور مرزائیوں کے درمیان مناظرہ ہوا۔ ثالث ایک پڑھے لکھے سکھ کو بنایا گیا۔ مسلمان مناظر
نے دلائل دینا شروع کیے کہ حضرت مسیح زندہ ہیں اور چوتھے آسمان پر موجود ہیں۔ مرزائی
مناظر اس کے خلاف یہ ثابت کرنے لگا کہ حضرت مسیح وفات پا گئے ہیں اور کشمیر میں
مدفون ہیں۔ تین گھنٹے مناظرہ ہوتا رہا اور دونوں فریق اپنے اپنے موقف کے ثبوت میں
دلائل دیتے رہے۔ آخر میں دونوں طرف کے مناظروں نے سکھ سے جو ثالث کے فرائض
انجام دے رہا تھا، کہا سردار جی! ہماری باتیں ختم ہوئیں۔ اب آپ فیصلہ فرمائیے کہ
ہمارے پیش کردہ دلائل کی روشنی میں آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ سردار جی کھڑے ہوئے۔
حاضرینِ مجلس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، بھائیو! میں نے دونوں صاحبوں کی باتیں
اچھی طرح کان لگا کر سُنیں۔ مجھے ان کی باتوں سے پتا چلا کہ حضرت مسیح انسان تھے۔
ایک صاحب نے بہت سی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت مسیح زندہ ہیں اور چوتھے
آسمان پر چلے گئے ہیں۔ دُوسرے صاحب نے کئی کتابیں پڑھ کر بتایا ہے کہ وہ چوتھے آسمان
پر نہیں ہیں، بلکہ فوت ہو گئے ہیں اور کشمیر کے ایک پہاڑی مقام میں دفن کر دیے گئے ہیں
اور وہاں ان کی قبر موجود ہے۔ دونوں صاحبان دینِ اسلام کی کتابیں پڑھ پڑھ کر یہی کچھ
کہتے رہے ہیں۔ ایک نے حضرت مسیح کو چوتھے آسمان سے پکڑا اور قبر میں لے آیا۔
دوسرے نے قبر کی گہرائی سے نکالا اور چوتھے آسمان کی بلندی پر لے گیا۔ یہ کام بار بار کیا
گیا ہے۔ میں ان کی باتیں سُن کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر وہ زندہ بھی تھے، تو ان تین
گھنٹوں میں ضرور مر گئے ہیں کیونکہ انسان اگرچہ کتنا ہی تگڑا ہو، اتنی کھینچا تانی برداشت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کر سکتا۔

دوسرا لطیفہ پادری عبدالحق کے بارے میں ہے۔

پادری عبدالحق بہت بڑے عیسائی مناظر تھے۔ منطق اور فلسفے میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور مناظرے میں اتنی منطقیانہ اور فلسفیانہ اصطلاحیں استعمال کرتے تھے کہ ان علوم کے بڑے بڑے عالم ان کے مقابلے میں بعض اوقات پریشان ہو جاتے تھے۔ ساتھ ہی بڑے چرب زبان اور لسّان تھے۔ آزادی سے کئی سال بعد یو۔پی کے شہر آگرہ میں فوت ہوئے۔ گوجرانوالہ میں مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور بعض دیگر اہل علم سے ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہا۔

گوجرانوالہ کو ہمیشہ ایک مذہبی شہر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس میں مختلف مذہبی فرقوں اور جماعتوں کے اصحابِ علم کے مناظرے ہوتے رہے ہیں۔ پادری عبدالحق سے بھی متعدد حضرات نے مناظرے کیے۔ ایک مناظرہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور پادری عبدالحق کے درمیان ہوا۔ مولانا سیالکوٹی بلاشبہ جلیل القدر عالم تھے، لیکن ان کی طبیعت میں جلال کا غلبہ تھا اور حریف پر جلد ہی خفگی کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ یہ بات مناظرانہ اصول کے خلاف ہے۔ اس سے پادری صاحب نے فائدہ اٹھایا اور مولانا پر چڑھتے چلے گئے۔ مناظرہ توحید اور تثلیث کے موضوع پر ہو رہا تھا۔ پادری صاحب نے کہنا شروع کیا کہ منطق کی رُو سے توحید کُلّی ہے یا جزئی۔ اگر کلّی ہے تو کون سی کُلّی ہے اور اس کلّی میں کہیں جزئی بھی آتی ہے یا نہیں؟ اگر آتی ہے تو کس صُورت میں؟

گوجرانوالہ کے ایک عالم و مقرر مولانا نورحسین گرجاکھی بھی سٹیج پر موجود تھے۔ وہ اتنے بڑے عالم تو نہ تھے، لیکن مناظر بہت اچھے تھے اور طبیعت کے ٹھنڈے تھے۔ اُنھوں نے مولانا ابراہیم صاحب سے کہا کہ حضرت آپ تشریف رکھیں، چند منٹ کے لیے مجھے پادری صاحب سے بات کرنے دیں۔ پہلے تو مولانا سیالکوٹی نے ان کو ڈانٹ پلائی، لیکن جب اصرار بڑھا تو انھیں تقریر کا موقع دیا گیا۔ مولانا نورحسین گرجاکھی نے اٹھتے ہی فرمایا: "پادری صاحب! میرے ساتھ بات کریں۔ میں ابھی آپ کی کلّیاں جلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر راکھ کا ڈھیر بنا دُوں گا"۔۔۔ یہ الفاظ سُنتے ہی جو عیسائی وہاں موجُود تھے، گھبرا اٹھے اور پادری صاحب سے کہنے لگے۔ "خدا کے لیے مناظرہ بند کرو۔ آپ تو چلے جائیں گے، ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ مسلمان ہم غریب عیسائیوں کی کُلّیاں جلادیں گے، تو ہم کہاں جائیں گے۔ ہم بال بچّوں والے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کُلّیوں میں گزارا کرتے ہیں۔ یہ جل گئیں تو ہم کہیں سر نہیں چھپا سکیں گے"۔

پادری صاحب نے ہر چند عیسائیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ منطق کی کلّی اور ہوتی ہے اور رہائش کی کُلّی اور ہوتی ہے۔ منطق کی کلّی کا رہائش کی کلی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن مولانا نور حسین کا تیر چل چکا تھا اور اثر دکھا رہا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ پادری عبدالحق اپنے تمام علم و فن کے باوجود ہار گئے، اور مولانا نور حسین نے محض حاضر جوابی سے میدان جیت لیا۔

مناظروں کا ایک دَور تھا اور عجیب دور تھا۔ یہ سلسلہ ہمارے ہاں دراصل اس وقت شروع ہوا تھا جب انگریز ہندوستان میں آئے اور اپنے ساتھ مشنری پادریوں کو بھی لائے جن کا کام برصغیر کے مختلف مذاہب کے بعض پہلوؤں کی تردید کرنا اور اس کے مقابلے میں عیسائیت کی اچھائیاں بیان کرنا تھا۔ اسلام کو وہ بالخصوص نشانہ تنقید بناتے تھے، کیوں کہ اس ملک کی حکومت مسلمانوں ہی سے چھینی گئی تھی اور ان کو مذہبی اور سیاسی اعتبار سے بدنام کرنا مقصود تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو کئی قسم کا لالچ دیکر اُنھوں نے عیسائی بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی، چنانچہ مختلف اوقات میں بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے عیسائیت قبول کی اور اس کی تبلیغ کے لیے کوشاں ہوئے اور پادری کہلائے۔ مثلاً پادری برکت علی، پادری عبدالحق، پادری رام چندر اور پادری ہردیال وغیرہ۔ سکھوں کا کردار اس ضمن میں لائق تعریف رہا۔ ان میں سے چند ایک نے کسی وجہ سے عیسائی مذہب تو اختیار کیا لیکن کوئی سکھ پادری یا مبلغ عیسائیت نہیں ہوا؛ چنانچہ آپ کو کوئی پادری رام سنگھ یا پادری دیال سنگھ وغیرہ نام کا دکھائی نہیں دے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشنری پادریوں سے باقاعدہ مناظرے اور مباحثے کرنے والے اہل علم میں شاہ عبدالعزیز محدث رح دہلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، سید آل حسن رح موہانی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح، سید امیر حسن سہسوانی، مولانا محمد بشیر سہسوانی وغیرہ بے شمار بزرگوں کے اسمائے گرامی کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ بعد ازاں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور بعض دیگر علمائے کرام نے اس میدان میں بہت شہرت پائی۔

عیسائی پادریوں کے بعد آریہ سماجیوں، دیو سماجیوں، سناتن دھرمیوں اور مرزائیوں سے مناظرات کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ پھر مختلف فقہی مسالک کے حاملین کے بھی آپس میں مناظرے ہوتے رہے۔

مجھے چند مناظرے سننے اور دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے صدر مقرر کر کے ایک دوسرے کے بالمقابل میز کرسیاں رکھ کر بیٹھ جاتے، حوالے کی کتابوں کے ڈھیر لگا لیے جاتے اور کچھ لوگ مناظر کو تیزی سے حوالے نکال کر دیتے جاتے۔ مدعی مناظر تقریر کا آغاز کرتا اور دعوے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے اسے دس منٹ وقت دیا جاتا۔ بعد میں جواب دعویٰ پیش کرنے والے کو بھی دس منٹ دیے جاتے۔ اس کے بعد دونوں مناظر پانچ پانچ منٹ میں سوال و جواب کا سلسلہ آگے بڑھاتے۔ ثالث کسی ایسے پڑھے لکھے شخص کو بنایا جاتا جس کا فریقین کے مذہب سے تعلق نہ ہوتا اور وہ غیر جانب دار ثالث کہلاتا۔ بعض دفعہ مناظرہ دو تین گھنٹوں یا اس سے بھی کم وقت میں ختم ہو جاتا اور بعض اوقات کئی کئی دن چلتا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری غالباً تنہا مناظر تھے جو شرائطِ مناظرہ طے کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے، اصل چیز کلمۂ حق دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اس میں کوئی پیشگی شرط عائد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو شخص جب چاہے، جہاں چاہے اور جس موضوع پر چاہے، مناظرہ کر لے۔

یہ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ کسی صاحب کو تھوڑی بہت محنت کر کے مناظرین کی فہرست تیار کرنی چاہیے اور مناظروں کے لطیفے اور ان کی حاضر جوابی و حاضر دماغی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعات معرضِ تحریر میں لانے چاہئیں - میرے خیال میں یہ بھی اسلام کی خدمت کا ایک پہلو ہے - آج کل بھی بعض دانشور حضرات جو غیر سے مسلم معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، اسلامی احکام واوامر پر قریب قریب اسی قسم کے اعتراضات کرتے ہیں جس قسم کے غیر مسلم کرتے تھے اور کرتے ہیں - مناظرانہ لطائف کے ہلکے پھلکے انداز میں اسلام کے خلاف کیے جانے والے بہت سے اعتراضات کے مسکت جواب آجاتے ہیں -

بات خلیفہ صاحب اور ان کی مجلس کے بارے میں ہو رہی تھی - معذرت خواہ ہوں قلم نے جبر کا مظاہرہ کیا اور موضوع سے باہر قدم بڑھا دیا —— اب پھر اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں -

مولانا داؤد غزنوی کو مولانا رومؒ سے خاص تعلقِ خاطر تھا - مثنوی مولانا رومؒ وہ بہت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے - ایک دن مجھے حکم دیا کہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے خلیفہ صاحب کی دو کتابیں —— تشبیہاتِ رومی اور حکمت رومی —— خرید کر لاؤں - شیش محل روڈ سے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے دفتر کلب روڈ تک آنے جانے کا کرایہ بھی دیا اور ادارے کی فہرستِ کتب دیکھ کر، ان کتابوں کی قیمت بھی عطا فرمائی - میں ساڑھے دس بجے کے قریب ادارے میں پہنچا تو خلیفہ صاحب کا دربار جما ہوا تھا - محفل گرم تھی اور چائے کا دور چل رہا تھا - ازراہِ کرم خلیفہ صاحب نہایت شفقت سے پیش آئے اور برکت اللہ کو آواز دے کر میرے لیے چائے کی پیالی اور ایک بسکٹ منگوایا جو یہاں کا معمول تھا -

اُس وقت خلیفہ صاحب کی مجلس میں مشہور شیعہ عالم اور ادیب مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی تشریف فرما تھے - مرحوم خوش مزاج اور بلند اخلاق عالم تھے اور اردو ادبیات کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے - میرے مہربان تھے، اکثر ذرّہ نوازی فرماتے اور ادارہِ ثقافتِ اسلامیہ تشریف لاتے - ان کی میٹھی میٹھی باتیں بہت سی معلومات کا خزینہ تھیں، دوسرے کی بات انتہائی توجہ سے سُنتے اور اختلافِ رائے سے خوش ہوتے -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلیفہ صاحب جہاں بہت سی اصنافِ علم کا خزینہ تھے، وہاں لطیفہ بازی کا بھی گنجینہ تھے۔ لطیفے باز کو جب لطیفہ یاد آجائے تو اگرچہ کیسی مجلس ہو اور کسی قسم کے لوگ بیٹھے ہوں، لطیفہ سنائے بغیر اسے چین نہیں آتا۔ کسی کا مسلک لطیفے کی زد میں آتا ہو، کسی کی ذات اس کی لپیٹ میں آتی ہو، کسی کے علم پر چوٹ پڑتی ہو، کسی کی شرافت اس کا نشانہ بنتی ہو، لطیفے باز کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ لطیفہ سُنانا اس کا معمول ہو جاتا ہے اور روا روی میں سُناتا چلا جاتا ہے۔

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل سے مخاطب ہو کر بھی خلیفہ صاحب نے چند لطیفے سنائے، جن کا تعلق مذہبیات سے تھا لیکن مولانا نہایت تحمّل اور بُردباری سے اُن کے لطائف سنتے رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک دن خلیفہ صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا کہ مشہور شاعر اصغر گونڈوی، جگر مُرادآبادی کے اُستاد تھے۔ ایک لڑکی جس سے جگر شادی کرنا چاہتے تھے، اصغر گونڈوی کی نظروں میں آگئی اور کچھ عرصے بعد اس سے شادی کرلی۔ جگر کو ذہنی تکلیف تو بہت ہوئی مگر اُستاد سے کچھ کہہ نہ سکے۔ کچھ مدّت گزری تھی کہ اصغر گونڈوی وفات پاگئے اور وہ جگر مرادآبادی کے عقد میں آگئی۔ مولانا حنیف ندوی نے یہ واقعہ سُن کر کہا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی مصرعے پر دو شاعروں نے گرہ لگائی۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، میں خلیفہ صاحب کے دور میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک نہ تھا۔ لیکن سب رفقائے ادارہ سے میرا تعلق تھا، کبھی ادارے جاتا تو ان کی محفلِ لطائف میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا۔ ایک دن خلیفہ صاحب نے بتایا کہ میں جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں تھا، ایک مغنّیہ میرے پاس آئی۔ پانچ چھ دوست بیٹھے تھے اور مجلسِ ظرائف گرم تھی۔ اس نے نہایت مہذّبانہ لہجے اور نستعلیق زبان میں مجھ سے کہا کہ میں نے ایک مکان بنایا ہے، کوئی اچھا سا نام بتائیے جو اس کے صدر دروازے پر لکھا جائے۔ میں نے پُوچھا آپ کا نام کیا ہے؟

بولی: سردار بیگم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے کہا: مکان کا نام سردار منزل رکھ لیجیے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں خلیفہ صاحب شعبۂ فلسفہ کے صدر تھے۔ سنا ہے ایک صاحب اس زمانے میں وہاں ڈاکٹر عبدالحق تھے جو شعبۂ عربی کے صدر تھے۔ ایک پرانے حیدرآبادی نے ایک مرتبہ بتایا کہ لطیفہ بازی میں وہ بھی بہت مشہور اور تیز تھے۔ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور دونوں اپنے اپنے موضوع میں یگانۂ روزگار تھے اور دونوں میں خوب مبادلۂ لطائف ہوتا تھا۔ جوڑ برابر کا تھا۔

خلیفہ صاحب کا چہرہ سُرخ و سفید تھا اور ڈاکٹر عبدالحق کا رنگ اس کے برعکس سیاہ کالا۔ جب دونوں یونیورسٹی کلب میں اکٹھے ہو جاتے تو ایک دوسرے سے بڑھ کر بات کرتے اور لطیفوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ دونوں کی رنگت کی بنا پر کلب کے لوگ اس مجموعے کو "بلیک اینڈ وائٹ" کہتے تھے۔

ایک دن خلیفہ صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ جامعہ عثمانیہ کے بعض اساتذہ کو نظام حیدرآباد عثمان علی خاں نے ملاقات کے لیے بلایا۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔ ملاقات کے وقت نظام کی خدمت میں نذرانہ پیش کرنا ضروری تھا جو کم سے کم ایک اشرفی ہو۔ والیانِ ریاست کو اپنی اپنی ریاست کے مالک کی حیثیت تھی۔ مجھے نظام سے ملاقات کے باقاعدہ آداب سکھائے اور سمجھائے گئے۔ نظام تک پہنچنے کے لیے کئی دروازوں سے گزرنا پڑتا تھا اور ہر دروازے پر جھکنا ضروری تھا، لیکن اس انداز میں کہ پہلے دروازے پر کم، دُوسرے پر اس سے زیادہ، تیسرے پر اس سے زیادہ، اور آخری دروازے پر جس سے آگے نظام تشریف فرما تھے، گردن رکوع کے قریب جھکانا پڑتی تھی۔ پھر اسی طرح جھکی ہوئی گردن کے ساتھ نذرانہ پیش کیا جاتا اور اسی انداز میں پیچھے کو ہٹتے ہوئے ایک طرف ہوا جاتا تھا۔ میں اسی طرح گیا اور ایک اشرفی نذر کرتے ہوئے دل میں کہا: (یہاں انھوں نے ایک بڑی سی گالی دی) کہ لے یہ پہلی اور آخری اشرفی ہے جو اپنی فطرت اور ضمیر کے خلاف تھیں دے رہا ہوں۔

خلیفہ صاحب کسی سے مرعوب ہونے اور دب کر بات کرنے کے عادی نہ تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑے سے بڑے آدمی کو برابر کی سطح پر لا کر بات کرتے تھے۔ اگر کسی چھوٹے سے کچھ کہنا ہوتا تو نہایت شفقت آمیز لہجہ اختیار کرتے۔ رفقائے ادارہ کی موجودگی میں کوئی باہر سے آنے والا اہلِ علم ان سے گفتگو شروع کرتا تو سب رفقائے ادارہ کو اس میں شریک فرماتے اور ہر ایک کو بات چیت کا موقع دیتے۔

ادارے کے ہر ملازم سے مشفقانہ برتاؤ کرتے، کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو نظر انداز کر دیتے۔ ایک مرتبہ دفتر کے ایک چھوٹے ملازم نے گھر میں جلانے کے لیے دفتر کے ایک درخت سے کچھ ایندھن کاٹ لیا۔ ایک شخص نے خلیفہ صاحب سے اس کی شکایت کی تو بولے: "بھائی! اس غریب نے ایندھن کاٹ لیا تو کیا ہوا۔ دفتر کے لوگوں نے اپنی ضروریات دفتر ہی سے پوری کرلی ہے۔ شکایت کی بات تو جب ہوتی کہ یہ کسی کی چوری کرتا۔ اس نے اپنے گھر کی چیز گھر ہی میں رکھی ہے۔ سوچنا چاہیے کہ تھوڑی سی تنخواہ سے ایک ملازم کیا کچھ خرید سکتا ہے۔ اگر کوئی چیز آسانی سے دفتر سے میسر آسکتی ہے تو اُسے حاصل کر لینا اچھی بات ہے۔"

وہ بہت اچھے مقرر اور بہت بڑے مصنف تھے۔ جس روانی سے پنجابی اور اردو میں بات کرتے، اسی روانی سے فارسی، انگریزی، فرنچ اور جرمن زبانوں میں گفتگو کرتے تھے۔ عربی اُنھوں نے قیامِ حیدر آباد کے زمانے میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مولانا مامون سے پڑھی تھی اور اس میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ عربی مآخذ پر ان کی نظر تھی اور صحیح عربی پڑھتے اور اس کا مطلب سمجھتے تھے۔

جس موضوع سے متعلق کچھ لکھنا ہوتا، پہلے اس موضوع کی کتابیں پڑھتے اور مطالب ذہن نشین کر لیتے۔ پھر لکھتے چلے جاتے۔ جگہ جگہ کتاب کا حوالہ دینے کے عادی نہ تھے۔ جہاں ضروری سمجھتے اثنائے تحریر میں کتاب یا مصنف کا حوالہ دے دیتے۔ کتاب کا صفحہ، جلد، مقامِ طباعت اور سالِ اشاعت وغیرہ لکھنے کی انھیں عادت نہ تھی۔

حیدر آباد کے حلقۂ اہلِ علم میں ان کو نہایت عزت و احترام کا مقام حاصل تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے ہر شعبے کے اساتذہ ان کی تکریم کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۸ء کے جون کی بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ایک استاد، جن کا نام عبدالجبار تھا، لاہور تشریف لائے، وہ خلیفہ صاحب پر پی۔ایچ۔ڈی کر رہے تھے۔ پہلے وہ خلیفہ صاحب کی صاحب زادی ڈاکٹر رفیعہ حسن (شعبۂ نفسیات پنجاب یونیورسٹی) سے ملے۔ پھر ان کے کہنے سے بعض دیگر حضرات سے ملاقات کی اور خلیفہ صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں بھی تشریف لائے اور رفقاے ادارہ سے باتیں کیں۔ ازراہِ کرم مجھ سے بھی ملے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جامعہ عثمانیہ کے موجودہ اساتذہ میں سے کوئی اُستاد خلیفہ صاحب کو جانتے اور ان کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہیں ؟ انھوں نے بتایا کہ جامعہ عثمانیہ میں چار اُستاد تو خلیفہ صاحب کے پُرانے ساتھی ہیں اور وہ ان کی وسعتِ علم سے انتہائی متاثر ہیں اور ان کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔ کچھ خلیفہ صاحب کے شاگرد ہیں جو جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہاں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے طلبا کے سامنے خلیفہ صاحب کی ہمہ گیریٔ علوم و فنون کے تذکرے مسرت آمیز اسلوب میں کرتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ انھیں خلیفہ صاحب کی شاگردی کا اعزاز حاصل ہے۔

میں نے عبدالجبار صاحب سے کہا کہ میں اگرچہ خلیفہ صاحب کی وفات سے تقریباً چھ سال بعد اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہوا ہوں، تاہم اُن کی زندگی میں اُن کی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور اُن کی باتیں سننے کا موقع ملتا رہا ہے۔ خلیفہ صاحب کی بعض باتیں میں نے ان کو بتائیں جو انھوں نے لکھ لیں۔ پھر مجھ سے کہا کچھ باتیں آپ اپنے قلم سے مجھے لکھ دیں، میں انھیں آپ کے خط ہی میں شامل مقالہ کروں گا۔ چنانچہ دو یا تین صفحے میں نے اُن کو لکھ دیے اور اُن کے کہنے سے نیچے اپنے دستخط بھی کیے اور تاریخ بھی لکھی۔

خلیفہ صاحب کی ذات میں اللہ نے بہت سی خوبیاں جمع کر دی تھیں۔ وہ نہایت ذہین و فطین اہلِ علم تھے۔ شعر و شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور فارسی اور اُردو شعر کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے۔ دورانِ گفتگو میں برمحل اور برموقع شعر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑھتے تھے۔ مختلف زبانوں کے محاوروں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ایک مرتبہ ڈھاکہ میں فلسفہ کانگرس کا اجلاس منعقد ہورہا تھا۔ اس میں مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ کسی وجہ سے خلیفہ صاحب اس میں شریک نہیں ہورہے تھے۔ مولانا ندوی کو کانگرس کی طرف سے جب ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملا، اس وقت خلیفہ صاحب کا دربار لگا ہوا تھا۔ خلیفہ صاحب نے ٹکٹ دیکھ کر کہا: "ہر چہ بر باد است، بر باد است" ــــ خلیفہ صاحب کی زبان سے فارسی کا یہ محاورہ سنتے ہی مولانا حنیف ندوی کا رنگ بدل گیا اور جس جہاز میں انھیں سفر کرنا تھا، وہ ان کے عالمِ تصور میں فضا میں ہچکولے کھانے لگا۔

شام کو حسبِ معمول ایک ہوٹل میں ملاقات ہوئی تو چہرے پر پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے۔

عرض کیا: "خیر تو ہے آج آپ افسردہ سے ہیں؟"

فرمایا: "کیا بتاؤں صبح سے بہت پریشان ہوں"۔

پوچھا: "ایسی کون سی بات ہے، جس نے آپ کو صبح سے پریشان کر رکھا ہے اور چہرے سے شگفتگی اور لبوں سے مسکراہٹ چھین لی ہے؟"

سچی بات ہے، انھیں افسردہ دیکھ کر میں خود افسردہ ہو گیا۔ افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را ــــ میں نے کہنیوں تک ہاتھ میز پر رکھے اور ذرا نزدیک ہو کر منہ ان کے منہ کے قریب کر کے فکر میں ڈوبے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا: "اتنی پریشانی کی آخر کیا وجہ ہے؟"

نہایت سنجیدہ اور معصوم سی شکل بنا کر نرم آواز میں بتایا کہ آج ڈھاکے کے لیے میرا ہوائی جہاز کا ٹکٹ آیا تو اسے دیکھ کر خلیفہ صاحب نے کہا: "ہر چہ بر باد ست، بر باد است۔" اس وقت سے سخت پریشان ہوں، سوچتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوائی جہاز میں بیٹھوں اور وہ گر کر پاش پاش ہو جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پریشانی کی یہ وجہ سُن کر میں نے ایک دم میز کا سہارا چھوڑا اور کُرسی پر ٹیک لگا کر زور کا قہقہہ لگایا۔ ان کے لبوں پر بھی ہلکی سی مصنوعی مسکراہٹ آئی اور بولے: "تم ہنس پڑے، میں ذہنی طور پر سخت پریشان ہوں۔"

میں نے کہا: آپ نے جو اتنا بڑا پہاڑ کھودا ہے، اس سے تو چھوٹی سے چھوٹی چوہیا بھی نہیں نکلی۔ لے دے کر چند لفظوں کا ایک محاورہ نکلا ہے جس کو آپ کے فکر و فہم نے اتنا بڑا بوجھ قرار دے لیا ہے کہ اس کے نیچے پڑا کراہ رہا ہے۔

اُنھیں کثرتِ پیشاب کا عارضہ تھا۔ کہا: تم ہنس رہے ہو، میں مارے فکر کے صبح سے پیشاب پر پیشاب کیے جا رہا ہوں۔ اب پھر پیشاب آگیا ہے۔

عرض کیا: "حضور! آپ پیشاب کیجیے ہزار مرتبہ۔ کوئی مائی کا لال آپ کو روک نہیں سکتا، لیکن یہ فرمایے کہ خلیفہ صاحب کے بولے ہوئے فارسی محاورے میں اتنی طاقت ہے کہ وہ فضا میں اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو زمین پر پھینک دے؟ خدا کے لیے اسے ذہن سے نکالیے اور اسے پیشاب آوری کا سبب نہ بنایے۔ اطمینان سے جہاز پر بیٹھیے اور ڈھاکے جا کر فلسفہ کانگرس میں شرکت فرمایے اور مقالہ پڑھیے۔"

بولے: "خلیفہ صاحب نے کچھ ایسے انداز میں یہ الفاظ کہے تھے کہ ہزار کوشش کے باوجود ذہن سے نہیں نکلتے۔ جی چاہتا ہے ٹکٹ واپس کر دوں اور ڈھاکے نہ جاؤں، لیکن پھر خیال آتا ہے، خلیفہ صاحب اور دوسرے حضرات مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے، چند لفظوں سے ڈر کر گھر میں بیٹھ گیا ہوں۔" اتنے میں مارے ڈر کے پھر پیشاب آگیا اور غسل خانے کو چل پڑے۔

تیسرے دن ہوائی اڈے پر پہنچے تو پھر وہی حال ہے اور وہی محاورہ ذہن میں گھوم رہا ہے اور پیشابوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا پیشاب باقاعدہ تسلسل کے ساتھ آ رہا ہے۔

عرض کیا: "آپ تسلی رکھیں۔ اتنے لوگ جو یہاں آئے ہیں اور ہوائی جہازوں سے مختلف مقامات کا سفر کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے کسی کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتی، کسی کو تو اس محاورے کا علم ہو گا ہی ۔"

بولے: "جس کو علم ہو گا۔ وہ میری طرح غسل خانے میں بیٹھا پیشاب کر رہا ہو گا، یا غسل خانے کی طرف دوڑا جا رہا ہو گا۔"

یہ مولانا حنیف ندوی کا وہ فضائی سفر تھا جو خلیفہ صاحب کے محاورے سے ان کے لیے انتہائی پیشاب آور ثابت ہُوا۔

مولانا کے ساتھ گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے ایک پروفیسر بھی فلسفہ کانگریس میں شرکت کے لیے اسی جہاز سے ڈھاکے جا رہے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ ان کو الوداع کہنے کے لیے لاہور آئی تھیں اور ہوائی اڈے پر موجود تھیں۔ وہ رخصت ہونے لگے تو بیوی نے کہا، ڈھاکے پہنچ کر خیر خیریت کا تار دے دینا تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے۔

پروفیسر صاحب نے کہا: "مجھے تار دینے اور آپ کو اس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کو جہاز اڑنے والا ہے۔ گھر جا کر ریڈیو سے خبریں سُننا شروع کر دو۔ اگر اس جہاز کی کوئی خبر ریڈیو سے نشر نہ ہوئی تو سمجھ لینا ہم خیر خیریت سے ڈھاکے پہنچ گئے ہیں۔"

ایک دن خلیفہ صاحب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور ان کتابوں کے متعلق بتا رہے تھے جو اس دلآویز اور رُوح پرور موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ سلسلۂ کلام میں سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کی کتاب "خطباتِ احمدیہ" کا ذکر آ گیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ۱۸۶۹ء میں سر سیّد لندن میں تھے، وہاں "لائف آف محمد" ان کے مطالعے میں آئی جو یو۔پی کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور نے لکھی تھی۔ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس کتاب میں نہایت گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ سر سید اس کتاب کو پڑھ کر بدرجۂ غایت کبیدہ خاطر ہوئے اور سرورِ کائنات کے بارے میں ان کے جذباتِ محبت کو بے حد ٹھیس پہنچی۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے قیامِ لندن ہی کے دور میں "خطباتِ احمدیہ" لکھنا شروع کی۔ کتاب کی تکمیل کے بعد اس کو چھاپنے کا مسئلہ بڑا اہم تھا اور سر سیّد کی مالی حالت اس قابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تھی کہ وہ آسانی سے اس کو کتابت و طباعت کے مراحل سے گزار سکتے۔ اُنھوں نے لندن سے نواب مُحسن الملک کو خط لکھا کہ ولیم میور کی لائف آف محمدؐ کا جواب ضرور دیا جائے گا اور میں اپنی کتاب ہر حال میں شائع کروں گا، اگرچہ مجھے اپنے گھر کی ہر چیز فروخت کر دینی پڑے، اور میں دُنیا میں اس کے نتیجے میں فقیر ہو کر بھیک مانگنے لگوں۔ قیامت میں تو اللہ کے حضور میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو حاضر کرو جو اپنے دادا حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔

خلیفہ صاحب یہ واقعہ سنا کر رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ کہا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے متعلق جس کے دل میں یہ جذبات پیدا ہو جائیں، اُمید رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن رسولِ اکرمؐ اس کی سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مغفرت فرمائے گا۔

بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ارشادات کا تحفظ کرنا اور ان پر عمل پیرا ہونا ہی ہمارے لیے ذریعۂ نجات ہے۔ اس کے علاوہ نجات و سُرخروئی کی ہرگز کوئی صورت نہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حضورؐ سے رشتۂ محبت استوار کر کے اپنے لیے ذخیرۂ بخشش فراہم کرتے ہیں۔"

خلیفہ صاحب صاف ذہن اور صاف دل کے آدمی تھے۔ ان کے خیالات و افکار واضح تھے۔ ان میں کوئی الجھاؤ، کوئی پیچیدگی اور کوئی گنجلک نہ تھی۔ ان کی زبان ان کے دل کی ترجمان تھی، ان کا کلام ان کے فکر کا آئینہ دار تھا، ان کی تحریر ان کے تصورات کی عکاس تھی۔ وہ خود بھی صاف اور واضح بات کرتے تھے، دوسرے سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ اینچ پینچ کی لعنت سے وہ آشنا ہی نہ تھے۔ جس سے جو بات کی، دوٹوک کی۔ اس سے کون کیا اثر لیتا ہے، اس کی انہیں پروا نہ تھی۔ کوئی اپنی جگہ چھوٹا ہو یا بڑا، ان کے نزدیک سب برابر تھے اور سب سے کھل کر بات کرتے تھے۔ اپنے آپ کو چھپانا اور دوسرے کے حلق سے اپنے مطلب کی بات اگلوانے کی کوشش کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ خلیفہ صاحب پیکرِ سخاوت تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو بلا تامل دے دیتے تھے، لیکن کسی کو سگریٹ پیش نہیں کرتے تھے، نہ کسی سے سگریٹ لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قینچی کا سگریٹ پیتے تھے اور ذہن میں یہ بات رہتی کہ شاید دوسرا شخص ان کا برانڈ پسند نہ کرے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو پیتا ہے، وہ اپنی پسند اور برانڈ کا پیئے۔ اپنے آپ کو اور دوسرے کو تکلف میں مبتلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ کبھی آزردہ خاطر اور مایوس یا پریشان نہیں ہوتے تھے۔ ان کا اصل موضوع فلسفہ تھا اور وہ اپنے عہد کے بہت بڑے فلسفی تھے۔ ان کے بارے میں فلسفیانہ اصطلاح میں بات کی جائے تو کہنا چاہیے کہ وہ رجائی (OPTIMISTIC) تھے۔ قنوطی (PESSIMISTIC) نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں ذہن سے رجا و امید کا رشتہ قائم رکھتے تھے۔ قنوط اور ناامیدی کے لیے ان کے حریم قلب اور احاطۂ فکر کے دروازے بند تھے۔ ذہن کو مایوسی کے حوالے کر دینا، دل پر قنوطیت کے قفل چڑھا لینا ان کے نزدیک تقاضائے ہوشمندی نہ تھا۔ اسی بنا پر وہ ہر شخص سے بہتری اور خیر کا برتاؤ کرتے تھے اور دوسرے سے بھی یہی امید رکھتے تھے۔ جب تک اپنے عمل و کردار سے انھیں کوئی مایوس نہ کر دے وہ اس کے بارے میں اظہارِ یاس نہ کرتے تھے۔

مولانا محمد حنیف نے جو خود بھی فلسفی تھے اور فلسفے میں خلیفہ صاحب کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے، ایک مرتبہ خلیفہ صاحب کے بارے میں ایک بڑی پیاری بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ خلیفہ صاحب عام طور سے فلسفے کے رجائی اور قنوطی دونوں نقطہ ہائے نظر کا موازنہ کرتے اور فرماتے کہ جہاں تک کسی سے دھوکا کھانے اور نقصان اٹھانے کا تعلق ہے اس میں کوئی امتیاز نہیں۔ نہ رجائی کی رجا پسندی اس کو دھوکے اور فریب سے بچا سکتی ہے، نہ قنوطی کی قنوط پسندی اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے، لیکن مایوسی سے پہلے مایوس ہو جانا قرینِ خردمندی نہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ ذہن و فکر کی سرحدوں سے رجا و امید کا تعلق قائم رہے۔ نہ اسے توڑا جائے اور نہ قبل از وقت اس سے پریشانی میں مبتلا ہوا جائے۔

مولانا حنیف ندوی نے یہ بات سنا کر کہا کہ در حقیقت خلیفہ صاحب کی رجائیت پسندی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی فلسفیانہ نقطۂ نظر کی آئینہ دار نہیں تھی، بلکہ ان کی فطرت و طینت ہی رجائیت پسندی کے سانچے میں ڈھلی تھی اور ان کا مزاج ہی ایسا تھا کہ اگر کسی سے مایوس ہونا بھی چاہیں تو آسانی سے نہیں ہو سکتے تھے۔

خلیفہ صاحب لاہور کے ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا کشمیر کی سکونت ترک کر کے لاہور آئے تھے اور مسجد چینیاں والی کے قریب اقامت گزیں ہو گئے تھے جو لاہور میں اہلِ حدیث کی مشہور اور قدیم مسجد ہے۔ خلیفہ صاحب کے دادا اور والد اس مسجد کے نمازیوں میں تھے۔

اسی علاقے میں جولائی ۱۸۹۴ء کو خلیفہ صاحب پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خلیفہ عبدالرحمٰن تھا اور وہ پشمینے کا کاروبار کرتے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم ابتدا ہی سے نہایت ذہین اور مطالعۂ کتب کے شائق تھے۔ تعلیم کا آغاز شیرانوالہ دروازے کے اسلامیہ ہائی سکول سے کیا۔ عمر کے بارھویں برس میں داخل ہوئے تھے کہ والد انتقال کر گئے۔ ۱۹۱۱ء میں اسی سکول میں میٹرک پاس کیا۔ اسی سال علی گڑھ گئے اور ایف اے میں داخل ہوئے۔ طالب علمی کے دورِ آغاز ہی میں انھوں نے تقریر کے میدان میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایف اے کے پہلے سال میں تھے کہ علی گڑھ کے ایم اے۔ او کالج کے ایک تقریری مقابلے میں حصّہ لیا جس میں بی۔ اے کے طالبِ علم بھی شامل تھے۔ اس مقابلے میں پہلا انعام خلیفہ صاحب کو ملا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں دلّی گئے اور وہاں کے سینٹ سٹیفن کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۵ء میں اس کالج میں بی۔ اے اور ۱۹۱۷ء میں یہیں فلسفے میں ایم اے کا امتحان دیا اور اوّل درجے میں رہے۔ امتحان میں انھوں نے رومی کے فلسفے سے متعلق مقالہ لکھا تھا جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ دلّی کے سینٹ سٹیفن کالج میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور لا کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۹ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی، مگر وکالت کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" شائع ہوتا تھا، اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ چند مہینے اس اخبار میں کام کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگست ۱۹۱۹ء میں حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ وہ فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اس یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور پھر زندگی کا بہت بڑا حصّہ یہیں گزارا۔

قیامِ حیدر آباد کے زمانے میں ۱۹۲۲ء میں یورپ گئے۔ یہ ان کا پہلا سفرِ یورپ تھا۔ وہاں جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اس یونیورسٹی میں "میٹافزکس آف رومی" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ مولانا روم ؒ کے فلسفے پر یہ ایک بہترین کتاب ہے جو ۱۹۳۳ء میں پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوئی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے سلسلے میں وہ تین سال ہائیڈل برگ میں رہے۔ ۱۹۲۵ء میں پھر حیدر آباد آ گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ فلسفہ مقرر ہوئے۔ اٹھارہ برس (۱۹۴۳ء) تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔

اسی سال (۱۹۴۳ء میں) اُنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اس طرح عارضی رخصت لی کہ وہ کشمیر جانا چاہتے ہیں، لیکن اگر وہاں مستقل قیام کی صورت پیدا نہ ہوئی تو واپس آ جائیں گے۔ کشمیر گئے تو پہلے اُنھیں امر سنگھ کالج (سری نگر) کا پرنسپل بنایا گیا۔ اس کے بعد ریاست کشمیر کا ڈائریکٹر تعلیمات مقرر کر دیا گیا۔ ان کا ارادہ وہاں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو جانے کا تھا، اسی لیے سری نگر میں نسیم باغ کے قریب بہت اچھا بنگلہ تعمیر کرا لیا تھا، لیکن ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر کے سیاسی حالات نے خطرناک شکل اختیار کر لی تو لاہور آ گئے اور پھر چند روز بعد دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کا عزم کیا۔ کشمیر میں اُنھیں اپنے بنگلے اور گھریلو سامان کے نقصان کا تو غم نہ تھا، البتہ اس کتب خانے کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس تھا، جسے وہ زندگی بھر کا اپنا علمی سرمایہ قرار دیتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی پہنچے تو اُنھیں میر شعبۂ فنون (ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس) مقرر کر دیا گیا۔ دو سال اس منصب پر مامور رہے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد پر حکومتِ ہند نے فوجی اقدام کیا تو وہاں کی علمی اور تہذیبی و ثقافتی صورت حال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت حد تک بدل گئی۔ اس سے متاثر ہو کر ۱۹۴۹ء میں خلیفہ صاحب اپنے وطن لاہور آگئے۔

۱۹۵۰ء میں انھوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ بیان ہے کہ جس زمانے میں خلیفہ صاحب حیدر آباد (دکن) سے پاکستان آئے اور لاہور میں قیام پذیر ہوئے، پاکستان کے وزیر خزانہ ملک غلام محمد اور وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان تھے۔ آزادی سے قبل ملک غلام محمد کئی سال ریاست حیدر آباد کے وزیر خزانہ رہے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کلب میں خلیفہ صاحب سے ان کی دوستانہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لیاقت علی خاں سے بھی خلیفہ صاحب کے بہت اچھے مراسم تھے۔ پاکستان آکر وہ ان دونوں سے ملے تو انھوں نے وہ جگہ جہاں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کا دفتر ہے، خلیفہ صاحب کے نام الاٹ کرنا چاہی۔ خلیفہ صاحب نے کہا میں تو پہلے سے لاہور کا رہنے والا ہوں اور ایک درمیانے درجے کے مکان کا مالک ہوں، مجھے ذاتی طور پر زیادہ لمبے چوڑے مکان کی ضرورت نہیں۔ اس بلڈنگ میں جو آپ مجھے دینا چاہتے ہیں، ایک تصنیفی ادارہ قائم کر دیجیے۔ چنانچہ خلیفہ صاحب نے اس کے اغراض و مقاصد لکھے، ضروری امور کی وضاحت کی اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ معرضِ قیام میں آگیا۔

خلیفہ عبد الحکیم کا دل گردہ دیکھیے کہ کلب روڈ پر اتنی بہترین جگہ انھوں نے اپنی ذات کے لیے حکومت سے نہیں لی، بلکہ حکومت سے ایک علمی و تصنیفی ادارہ قائم کرنے کی درخواست کی اور اسی کے لیے وہ جگہ حاصل کی جہاں اب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا دفتر ہے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے قیام سے لے کر اب تک اس کی طرف سے اردو اور انگریزی زبانوں میں تین سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، تنقید، ادبیات، تصوف، فلسفہ وغیرہ متنوع مضامین پر مشتمل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلیفہ صاحب نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ممتاز اہلِ علم اور نامور اصحابِ قلم کو جمع کر لیا تھا، مثلاً ان کی نگاہِ انتخاب ڈاکٹر رفیع الدّین، مولانا محمد حنیف، شاہ محمد جعفر پھلواروی بشیر احمد ڈار، شاہد حسین رزاقی، سید رئیس احمد جعفری اور مظہر الدین صدیقی پر پڑی اور ان حضرات نے ادارے کی بے حد علمی خدمت کی اور اونچے درجے کی تحقیقی کتابیں لکھیں۔ خود خلیفہ صاحب نے جو تصنیفی کام کیا، تحقیق و کاوش میں ڈوب کر کیا۔ وہ کئی مرتبہ امریکہ، کینیڈا، اندلس، لبنان، یورپ اور آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں اور انجمنوں کی دعوت پر گئے۔ وہاں اُنھوں نے اسلام کی حقانیت کا پیغام پہنچایا۔ اس کے اوامر و احکام کی تشریح کی اور اس کے نظریۂ امن و آشتی کو اُجاگر کیا۔

رئیس احمد جعفری صاحب نے ایک مرتبہ بتایا کہ خلیفہ صاحب بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور تذکرہ غوثیہ کے وہ واقعات جو حضرت غوث علی شاہ صاحب کی کرامات اور خرقِ عادات سے متعلّق ہیں، اس لہجے اور اسلوب سے سنایا کرتے تھے کہ وہ بالکل صحیح اور یقینی ہیں۔

رئیس صاحب نے بتایا کہ راولپنڈی میں کوئی مجذوب تھے، خلیفہ صاحب ان سے بہت متاثّر تھے۔ مری جاتے آتے وقت ان سے ضرور ملتے اور ان کے کشوف و کرامات کے بہت سے واقعات بیان کرتے۔ ان میں ایک واقعہ خلیفہ صاحب کی زبانی رئیس صاحب نے یہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنی لڑکی کے ساتھ اس مجذوب کو ملنے گئے۔ لڑکی کو دیکھتے ہی اُنھوں نے مسکرا کر کہا، اس کی شادی اس کی خالہ کے لڑکے سے ہو رہی ہے۔ خلیفہ صاحب مجذوب کے یہ الفاظ سُن کر سخت متعجّب ہوئے، اس لیے کہ واقعی لڑکی کی شادی ان کے خالہ زاد سے طے ہو چکی تھی۔

بقول رئیس صاحب کے، ایک دن خلیفہ صاحب نے اپنی ایک عزیزہ کا قصّہ بیان کیا کہ ان کے شوہر نے جو کام شروع کیا، ناکام ہوئے۔ دُعا کے لیے وہ ان مجذوب کے پاس پہنچیں۔ مجذوب نے دیکھتے ہی آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی اور کہا: دروازے بند ہیں، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا حنیف ندوی نے ایک مرتبہ خلیفہ صاحب کی باتیں کرتے ہوئے کہا کہ وہ اعلیٰ درجے کے جدید تعلیم یافتہ تھے اور خیالات و افکار کے بعض گوشوں میں الٹرا ماڈرن تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تصوّف اور صوفیا کے بہت قائل تھے اور بعض ایسی چیزوں کو بھی مانتے اور ان پر یقین رکھتے تھے کہ جن کی توقع ان سے قطعی طور پر نہیں کی جاسکتی تھی۔

وہ مسائلِ تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے بقول مولانا حنیف ندوی کے پورے وثوق سے کہا کرتے تھے کہ یہ عالمِ ہست و بُود صرف مادیت ہی پر مبنی نہیں ہے اور یہاں جو کچھ بھی ہے وہ مادہ ہی کے اظہار و نمود کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس دُنیا میں ایک رُوحانی عالم بھی آباد ہے، جس کا اس عالمِ اسباب سے گہرا تعلّق ہے۔

۱۹۶۹ء میں مرحوم پروفیسر حمید احمد خان کچھ مہینے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں بطور ایڈیشنل ڈائریکٹر خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ وہ خلیفہ صاحب کے ایک انگریزی مسودے پر نظرِ ثانی کر رہے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے بتایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن) میں جب خلیفہ صاحب فلسفے کے استاد اور صدر شعبہ تھے، وہ وہاں بی اے کے طالبِ علم تھے اور خلیفہ صاحب سے فلسفہ پڑھتے تھے۔ انھی دنوں خلیفہ صاحب نے ڈیبر کی کتاب ہسٹری آف فلاسفی کا "تاریخ فلسفہ" کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اُردو تھا، اس لیے خلیفہ صاحب طلبا کو اُردو میں لیکچر دیتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا انداز نہایت عُمدہ تھا اور مسائلِ فلسفہ کی اُردو میں تشریح بڑے دلآویز رنگ میں کرتے تھے۔

اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ خلیفہ صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے لیے دو تین مرتبہ پیشکش ہوئی، مگر اُنھوں نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے علیحدہ ہونا گوارا نہیں کیا۔ یہ ادارہ اُنھوں نے بہت محنت سے قائم کیا تھا اور اسے ہر صورت میں قائم رکھنا چاہتے تھے۔

۱۹۵۷ء کے جلسۂ تقسیمِ اسناد میں پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی، جس کی وجہ سے خود یونیورسٹی نے اپنے مقام و مرتبے میں اضافہ کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سید محمد جعفر شاہ پھلواروی نے ایک مرتبہ مجھے ایک خط دکھایا جو قادیانی جماعت کے خلیفۂ اوّل مولوی نورالدین نے ان کے والد محترم حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کو لکھا تھا۔ یہ خط غالباً ۱۹۱۱ء کا تحریر کردہ تھا۔ اس میں امام ابنِ تیمیہؒ کی ایک کتاب کے بارے میں (جو مصر سے شائع ہوئی تھی اور شاہ سلیمان کے پاس موجود تھی) لکھا تھا کہ یہ کتاب حال ہی میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔ ہندوستان میں فروخت کے لیے ابھی نہیں پہنچی۔ مجھے اپنے ذاتی مطالعے کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے سُنا ہے آپ کے کتب خانے میں یہ کتاب موجود ہے۔ میرا نام نورالدین ہے اور میں مرزا غلام احمد قادنی کا خلیفہ ہوں۔ اگر آپ مجھے یہ کتاب بھجوا سکیں تو شکر گزار ہوں گا۔ مطالعے کے بعد کتاب بحفاظتِ تمام ڈاک کے ذریعے واپس بھجوا دی جائے گی۔

سیّد جعفر شاہ پھلواروی نے یہ خط دکھا کر مجھے بتایا کہ ۱۹۵۶ء میں یہ خط اُنھوں نے خلیفہ صاحب کو دکھایا۔ خلیفہ صاحب نے پڑھا تو کہا، اپنی نوعیت کا یہ ایک تاریخی خط ہے جس میں خود مرزا صاحب کے خلیفہ اوّل نے ان کے لیے حضرت مسیح وغیرہ کے الفاظ استعمال نہیں کیے، صرف مرزا غلام احمد قادیانی لکھا ہے۔ اسے "ثقافت" میں چھاپ دیجیے۔

"ثقافت" ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ تھا جو جنوری ۱۹۵۵ء میں جاری کیا گیا تھا جنوری ۱۹۶۸ء سے اس کا نام بدل کر "المعارف" رکھ دیا گیا ہے۔

چوہدری ظفر اللہ اس زمانے میں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے اور اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے واشنگٹن گئے ہوئے تھے۔ یہ خط "ثقافت" میں چھپا اور رسالہ چوہدری ظفر اللہ کو ملا تو اُنھوں نے واشنگٹن سے خلیفہ صاحب کو خط لکھا کہ معلوم ہوتا ہے "ثقافت" میں شائع شدہ خط جعلی ہے۔ کیونکہ اس میں حضرت مسیح موعودؑ کے بارے میں گستاخانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ خلیفہ اوّل مولوی نورالدین یہ انداز اختیار نہیں کر سکتے تھے۔

اس زمانے میں فوٹو سٹیٹ وغیرہ کا انتظام نہیں تھا۔ خلیفہ صاحب نے چوہدری ظفر اللہ کا خط پڑھ کر مرزا صاحب اور چوہدری صاحب کو اپنے خاص اسلوب میں دو چار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنا ہیں اور پھر شاہ صاحب سے کہا کہ میری رائے ہے کہ یہ خط آپ چوہدری ظفر اللہ کو بھیج دیں تاکہ اُنھیں تسلّی ہو جائے۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ خط اُنھیں نہیں بھیجا۔

ایک دن ایک کتاب کے مصنّف نے خلیفہ صاحب سے کہا کہ میری کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ایک پبلشر نے مجھ سے بات کی اور میں نے اُسے کتاب چھاپنے کی اجازت دے دی۔ اب وہ پریشان کر رہا ہے، نہ کتاب چھاپتا ہے نہ انکار کرتا ہے

خلیفہ صاحب نے کہا، کتاب چھاپنے والے کو آپ انگریزی میں پبلشر کہیں یا عربی میں ناشر — دونوں میں لفظِ "شر" مشترک ہے، جس کا اظہار اس کے عمل و کردار سے ہوتا رہتا ہے۔

علمِ تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دن خلیفہ صاحب نے کہا کہ اس کو قطعی اور یقینی صداقت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بعض افراد کی زندگی کے شب و روز کچھ اور ڈھب سے گزرے ہوتے ہیں، لیکن ان کی موت کے بعد جب ان کے متعلق لوگ لکھنا شروع کرتے ہیں تو کچھ اور قسم کے واقعات ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے چند افراد کا نام لے کر کہا، میں اُنھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان کے نجی اور ذاتی معاملات کس نوعیت کے تھے، لیکن مرنے کے بعد اُنھیں رحمۃ اللہ علیہ کہا جانے لگا۔ مجھے شبہ پڑتا ہے، پہلے بھی رحمۃ اللہ علیہ اسی قسم کے ہوں گے۔ اُنھوں نے کہا عام طور پر تاریخ بنائی جاتی ہے، جس میں عقیدت کے جذبات، صداقت اور سچائی پر غالب آجاتے ہیں۔

ابتدا میں خلیفہ صاحب نے دفتر کی طرف سے ایک ایک بڑی میز اور تین تین کرسیاں خرید کر ہر رفیقِ ادارہ کے گھر پہنچا دی تھیں تاکہ وہ گھر میں میز کرسی پر آرام سے لکھنے پڑھنے کا کام کر سکیں۔

اُنھوں نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ وغیرہ کی چھٹیوں کے علاوہ دفتر کی طرف سے معراج شریف، شب برأت، میلہ چراغاں اور ماہِ صفر کے آخری چہار شنبہ کی چھٹیوں کو بھی ضروری قرار دیا۔ شب برأت کی چھٹی میں اُنھوں نے ایک اضافہ یہ کیا کہ چھٹی سے ایک دن پہلے دوپہر کو حلوہ پوری اور مچھلی پکانے کا سلسلہ جاری کیا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اجتماعی کھانا ہوتا تھا، جس میں عملے کے چھوٹے بڑے تمام ارکان شرکت کرتے اور ایک ہی دسترخوان پر اکٹھے بیٹھ کر کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلتا تھا۔

یہ سلسلہ ایم ایم شریف صاحب کے زمانۂ ڈائریکٹری میں بھی جاری رہا۔ ان کے بعد ایس ایم اکرام صاحب ادارے کے اکیڈمک ڈائریکٹر بن کر آئے تو ایک سال ان کے عہد میں بھی خلیفہ صاحب کی اکل و شرب کی جاری کردہ اس "سنت" پر عمل کیا گیا، لیکن بعد ازاں اکرام صاحب نے اسے بند کر دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ ادارے پر چالیس پچاس روپے کا یہ سالانہ بوجھ ہے۔

اگر اب تک یہ سلسلہ جاری رہتا تو ادارے پر کم و بیش ہزار روپے کا سالانہ بوجھ ثابت ہوتا۔ موجودہ ناظم علمی اسے اگر دوبارہ جاری کر دیں تو ہم لوگ جو پہلے اس سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں، آخری عمر میں بھی یہ حلوہ دیکھ لیں۔ یعنی اجتماعی حلوہ کھا لیں۔ کہتے ہیں ان اللہ حلو یحب الحلوہ۔

خلیفہ صاحب نے انگریزی اور اُردو میں متعدد کتابیں تصنیف کیں اور کئی انگریزی کتابوں کے اُردو ترجمے کیے۔ ان کتابوں میں سے بعض ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے اور بعض دوسرے اداروں کی طرف سے شائع کی گئیں اور اہلِ علم میں مقبول و متداول ہوئیں۔ یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تشبیہاتِ رُومی: مولانا جلال الدّین رومیؒ تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ ہر بار ایک نکتے کی وضاحت کے لیے ایسی دل نشیں تشبیہ دیتے ہیں جو یقین آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی۔ خلیفہ صاحب نے جو رُومیات کے ممتاز عالم و مفکر تھے، ان تشبیہات کو اس کتاب میں دلکش اور پُرکیف انداز میں بیان کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ حکمتِ رُومی : اس کتاب میں خلیفہ صاحب نے مولانا جلال الدین رُومی کے افکار و نظریات کی حکیمانہ تشریح کی ہے، جو ماہیتِ نفسِ انسانی، عشق و عقل، وحی والہام، وحدتِ وجود، احترامِ آدم، صورت و معنیٰ، عالمِ اسباب اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۳۔ الٰہیاتِ رُومی (انگریزی) : اس میں رُومی کے ان افکار و تصوّرات کی تشریح کی گئی ہے جو الٰہیاتِ اسلامی کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب عالمِ مادی، عالمِ رُوحانی، تخلیق، ارتقا، عشق، مشیّت، انسانِ کامل، فنا و بقا، وجودِ باری تعالےٰ، وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود جیسے اونچے درجے کے فلسفیانہ مسائل پر محیط ہے۔

۴۔ افکارِ غالب : اس میں مرزا غالب کے بلند پایہ فلسفیانہ کلام کی تشریح کی گئی ہے یہ کتاب اُردو ادب میں قابلِ قدر تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے۔

۵۔ فکرِ اقبال : اس کتاب کو اقبالیات کے سلسلے میں گراں قدر اضافے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس میں علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے ہر پہلو کی عمدہ اسلوب میں وضاحت کی گئی ہے۔

۶۔ اسلام اینڈ کمونزم (انگریزی) : یہ اسلامی اور اشتراکی نظریات کا تقابلی مطالعہ ہے جس میں اسلامی تصوّرات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں اور اس کے مقابلے میں اشتراکی نقطۂ نظر کے نقائص اُجاگر کیے گئے ہیں۔

۷۔ اسلام کا نظریۂ حیات : یہ خلیفہ صاحب کی انگریزی کتاب "اسلامک آئیڈیالوجی" کا اُردو ترجمہ ہے۔

۸۔ مقالاتِ حکیم : یہ خلیفہ صاحب کے مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات جناب شاہد حسین رزاقی صاحب نے مرتب کیے ہیں۔ پہلی جلد اسلامیات اور دوسری اقبالیات سے متعلق مقالات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد متفرق اور مختلف عنوانات کے مقالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۹۔ **کلامِ حکیم**: یہ ان کا مجموعہ کلام ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنے اچھے شاعر تھے۔
کلامِ حکیم کے مرتب ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ہیں۔

یہ خلیفہ صاحب کی وہ کتابیں ہیں جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئیں۔ اب ذیل میں ان کی مزید خدماتِ ترجمہ و تصنیف کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۰۔ **تاریخ فلسفہ**: ڈیبر کی "ہسٹری آف فلاسفی" کا ترجمہ، جو قیامِ حیدر آباد کے زمانے میں کیا۔

۱۱۔ **تاریخ فلسفہ جدید**: ہیرالڈ ہوفڈنگ کی "ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی" کا ترجمہ۔

۱۲۔ **تاریخ فلسفہ یونان**: ایڈورڈ زِلر کی "آوٹ لائن آف گریک فلاسفی" کا ترجمہ۔

۱۳۔ **نفسیاتِ وارداتِ رُوحانی**: ولیم جیمز کی کتاب کا ترجمہ جو ۱۹۵۸ء میں مجلسِ ترقی ادب نے شائع کیا۔

۱۴۔ **بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ**۔

۱۵۔ **داستانِ دانش**: یہ فلسفے کی سرگزشت ہے جو خلیفہ صاحب نے دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

ان پندرہ تصانیف و تراجم کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔

متحدہ ہندوستان میں خلیفہ صاحب آل انڈیا فلسفہ کانگرس کے مابعد الطبیعیات کے سیکشن اور نفسیات کے سیکشن کے صدر تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان فلسفہ کانگرس کی بنیاد ڈالی گئی تو اس کے پہلے اجلاس کی صدارت خلیفہ صاحب نے کی تھی۔

وہ عام طور سے ہر بات اور ہر سوال کا جواب لطیفے کے انداز میں شروع کرتے تھے اور لطیفے لطیفے میں مشکل سے مشکل مسئلہ نہایت آسانی سے حل کر دیتے تھے۔

وہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور علمی و فکری اعتبار سے ان میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھی۔ وہ حکومت کی قائم کردہ کئی مجلسوں کے رکن تھے۔
۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء کو وہ اسلامی مجلس مذاکرہ میں شرکت کے لیے کراچی گئے۔ اس کے چار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جلسوں میں شریک ہوئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق پانچویں جلسے کی صدارت جو ۳۰ جنوری کو ہو رہا تھا، خود انھیں کرنا تھی۔ ۳۰ جنوری کی صبح کو وہ مرکزی وزیر تعلیم حبیب الرحمٰن سے ملے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کو مزید ترقی دینے کی تجاویز پر مبادلۂ خیال کیا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں وزارتِ مالیات میں عبدالمجید صاحب سے ملاقات کی اور پھر ممتاز حسن صاحب سے ملنے گئے۔ ان کے کمرے میں بیٹھے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے متعلق ان سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔

یہ سوا دو بجے دوپہر کا عمل تھا۔ اسی وقت لاہور میں ٹیلی فون کے ذریعے ان کے اہلِ خانہ کو اطّلاع دی گئی اور ریڈیو پاکستان سے اس سانحے کی خبر نشر ہوئی۔ کراچی سے بذریعہ طیّارہ ان کی میّت لاہور لائی گئی۔ دوسرے دن گیارہ بجے ان کا جنازہ اس عالمِ خاکی میں ان کی عارضی قیام گاہ ۱۴۱۔ وارث روڈ سے اُٹھا اور میانی صاحب کے قبرستان میں ان کے والد خلیفہ عبدالرحمٰن کے پہلو میں جو ان کی ابدی قیام گاہ ہے، اُنھیں سُپردِ خاک کر دیا گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ مضمون راقم کی تصنیف "بزمِ ثقافت" سے ماخوذ ہے جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ناظمین اور رفقائے کرام کے تاثراتی سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔ مقدمہ کتاب میں ادارے کے قیام، اس کی ضرورت و اہمیت اور اغراض و مقاصد پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

اس کی کتابت ہو چکی ہے، جلد ہی انشاء اللہ طبع ہو جائے گی۔

© rasailojaraid.com